https://telegram.me/ilmokitab

تصویر — سرور بارہ بنکوی

''روشنائی'' کراچی میں ''آدھا مسلمان'' (نظیر صدیقی کا خاکہ) پڑھ کر ہماری بیٹی نے نہایت سنجیدگی سے کہا، ''آپ نے مسز نظیر صدیقی کے نام سے کیوں نہیں لکھا، آپ کا نام کون جانتا ہے۔''

رخشی کی اس بات سے مجھے ۱۹۶۷ء کا ڈھاکا یاد آ گیا۔

''اگر میلاد کے دعوت نامہ پر مسز نظیر صدیقی لکھ دیتیں تو میں عارفہ اور بچیوں کو بھیج دیتا۔ ہم لوگ سوچتے رہ گئے کہ یہ دعوت نامہ کہاں سے آیا ہے۔ آئندہ اس طرح کی کوئی بات ہو تو مسز نظیر صدیقی لکھیں، آپ کا نام کون جانتا ہے۔''

سرور بھائی کی یہ نصیحت میرے دماغ میں ایسی جا کر ٹھکی کہ میں اپنا نام لکھنا بھول گئی۔

دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے اسلام آباد کی ایک شام ٹمٹمائی۔ نظیر صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے، ''یہ شناختی کارڈ کا فارم ہے، دستخط کرو۔'' میں نے آنکھ بند کر کے مسز نظیر صدیقی لکھ دیا۔

''یہ کیا لکھا ہے تم نے، اپنا نام لکھیں۔ مسز نظیر صدیقی تو کوئی بھی ہو سکتی ہے۔''

ساری زندگی انھوں نے مجھے اپنے جملوں کی زد میں رکھا۔

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' رخشی نے مجھ سے پوچھا اور میں جو سوچ رہی تھی بیٹی کو بتادیا۔

''یہ تو اچھی علامت ہے۔ اس کے معنی آپ کا ذہن ٹھیک کام کر رہا ہے۔ یہ لیں رجسٹر اور قلم، انھیں باتوں کو لکھتی رہیں۔ آپ کا وقت اچھا گزر جائے گا۔''

ڈاکٹر صاحبہ نسخۂ وقت گزاری بتا کر مطمئن ہو گئیں۔ وقت کس کے روکے رکا ہے۔

مگر بڑھاپے میں آ کر وقت بھی رک رک کر چلنے لگتا ہے۔ عمر کا یہ حصّہ بھی بچپن کی طرح ایک دم گزر جائے تو کتنا اچھا ہو۔

ہماری شادی کو ایک ڈیڑھ برس ہوا تھا۔ ہم لوگ محمد پور ذاتی مکان میں منتقل ہو چکے تھے۔ ۱۹۶۶ء کی ایک دوپہر کالج سے آتے ہی نظیر صاحب کہنے لگے، ''جلدی سے ایک آدھ چیز اور بنالو، میرے ساتھ سرورؔ بھی ہیں۔''

میں نے تعمیلِ ارشاد میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔

''کھانے کے بعد چائے لے کر آؤ اور ان سے مل لو۔'' نظیر صاحب ہدایت دے کر باورچی خانے سے چلے گئے۔

میز پر چائے رکھ کر سلام کر کے میں خاموشی سے بیٹھ گئی۔ نظیر صاحب کی فرمائش پر وہ ترنم سے اپنی غزل سنانے لگے۔ میں اٹھ کر جانے لگی تو نظیر صاحب نے کہا، ''یہ کیا حماقت ہے۔ بیٹھو۔''

ان کے لہجے میں ہلکی سی ڈانٹ تھی۔

''آپ کی بڑی ہمت ہے۔نقاد سے شادی کی ہے۔'' سرور بارہ بنکوی پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوئے۔

یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔

''آپ کے سرور بارہ بنکوی کی بات مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔آئندہ ہم آپ کے کسی دوست سے نہیں ملیں گے۔'' میں نے نظیر صاحب کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''میرے پرانے دوست ہیں، ایک جملہ کہہ دیا تو اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔آپ جملہ سہنا سیکھیں۔''

نظیر صاحب اپنے دوستوں پر تنقید سننے کے عادی نہیں تھے (کم از کم میری زبان سے)۔

رفتہ رفتہ میں نے جملہ سہنا اور بولنا بھی سیکھ لیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے گھر چھٹ بھیئے قسم کے لوگوں کی آمد و رفت میں کمی آگئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا (نظیر صدیقی ان لوگوں کو بھی اپنا دوست کہا کرتے تھے۔یہ ان کی بڑائی تھی۔میرے نزدیک وہ لوگ دشمنی کے قابل بھی نہیں تھے)۔

''کل رات سرور نے ہمیں کھانے پر مدعو کیا ہے، تیار رہنا۔'' نظیر صاحب نے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

شام سے کچھ دیر پہلے ہم دونوں سرور بھائی کے گھر پہنچ گئے۔وہاں غیر معمولی ہلچل دیکھ کر میں نے عارفہ بھابھی سے پوچھا،''کیا آپ نے کچھ اور لوگوں کو بھی بلایا ہے؟''

''نہیں، صرف آپ لوگ ہیں۔آج میری خالہ ہندوستان سے آرہی ہیں۔''

ان کی آواز میں بچھڑی ہوئی خالہ سے ملنے کی خوشی تھی (سرور بھائی کی والدہ ان

کی خالہ تھیں)۔ عارفہ بھابھی ہنس مکھ، بھلی سی خاتون تھیں۔ سرور بھائی کی والدہ مجھے بنگالن سمجھ کر لیے دیے رہیں۔ جلد ہی بھابھی نے ان کی غلط فہمی دور کر دی۔ پھر وہ مجھے اپنے سفر کی روداد سنانے لگیں۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں بھارت میں رہ جانے والے بزرگوں کے دکھ کو آج کی نسل نہیں سمجھ سکتی۔ بزرگ وہاں ماضی کے دھندلکوں میں جی رہے تھے۔ ادھر پاکستان میں نئی نسل اپنے خوش آئند مستقبل کے خواب کے سہارے زندگی کر رہی تھی۔

سرور بارہ بنکوی کی والدہ کے لہجے میں بھی اپنے بچوں سے دوری کا دکھ تھا۔

”یہ پاکستان حلال روزی کی تلاش میں آئے تھے۔ یہاں آ کر حرام کاری میں پڑ گئے۔ یہی سب کچھ کرنا تھا تو وہیں رہتے۔“

ان کا اشارہ اپنے بیٹے کے فلمی کاروبار کی طرف تھا۔ ہم اور بھابھی ان کی اس بات پر اپنی ہنسی چھپانے میں ناکام رہے۔

”سرور نے تمھارے بارے میں ایک دلچسپ جملہ کہا ہے۔“ نظیر صاحب ان کا جملہ سنانے لگے، ”نظیر! تمھاری بیوی کی خوبی یہ ہے کہ وہ بہار کی ہیں مگر بہاری نہیں لگتیں۔“

مجھے ذرا بھی ان کا جملہ پسند نہیں آیا۔ میں نے راستے میں ڈرتے ڈرتے اپنی رائے کا اظہار کیا، ایک زمانے میں مجھے ان کے دوستوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

ایک شام میری نئی نویلی ممانی ہمارے گھر تشریف لائیں۔ باہر کمرے میں چائے کا سامان دیکھ کر مجھ سے پوچھا، ”کوئی آیا تھا کیا؟“

”جی ہاں، ابھی عطاء الرحمٰن جمیل اور سرور بارہ بنکوی اٹھ کر گئے ہیں۔“ میں

نے انھیں بتایا۔

''اچھا، سرور بارہ بنکوی بھی آتے ہیں! بھئی تم ہمیں ان پیالیوں میں چائے مت دینا۔''

آج کی افسانہ نگار شہناز پروین نے ایک ہی جملے میں اپنا علامتی افسانہ سنا دیا۔ میں سناٹے میں آ گئی۔

پینتیس چالیس برس قبل ان باتوں کو ذرا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے اب صورتِ حال قطعی مختلف ہے۔ آج کی لڑکیوں پر باپ بیٹے جامِ صحت ٹکراتے ہیں، کوئی کچھ نہیں کہتا۔ دنیا چھوٹی ہو گئی ہے اس لیے سب نے اپنا دل بڑا کر لیا ہے۔

۱۹۶۹ء دسمبر کی ایک اداس شام ہم نے اپنے ساتھ کراچی جانے والے سامان کا آخری جائزہ لیا۔ غالبؔ کی تصویر چھوڑ جائیں، کراچی میں بہت مل جائے گی۔ اتنی بڑی فریم شدہ تصویر کا پلین میں آنا مشکل ہے۔ مجھ پر سخت وحشت طاری تھی۔ ہمیں کراچی جانے کی خوشی کم، بھرا گھر چھوڑ جانے کا غم زیادہ تھا۔ نظیر صاحب گھر میں رہ جانے والی کتابوں کو دیکھتے اور اپنے ہاتھوں سے شیلف پر اخبار وغیرہ ڈالتے اور پانی پی کر بیٹھ جاتے۔ ایسے میں ہم نے انھیں غالب کی تصویر چھوڑ جانے کا مشورہ دیا۔ ان کا دکھ غصّے میں تبدیل ہو گیا۔

''یہ تصویر سرورؔ کا تحفہ ہے۔ وہ میرے لیے کراچی سے لے کر آئے تھے۔ آپ اپنا سامانِ جہالت چھوڑ جائیں۔''

نظیر صاحب نے تصویر کو احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ کر اپنے سامان کے ساتھ رکھ دیا۔ وہ تصویر آج بھی ہمارے گھر میں محفوظ ہے۔ اب میں نے تصویر میں نیا فریم لگوا

دیا ہے۔

ایک دوپہر نظیر صاحب یونیورسٹی سے آئے تو باہر ہی سے مجھے آواز دی، ''فرحت! دیکھو کون آیا ہے۔''

رخشی باپ کی آواز سن کر مجھ سے پہلے ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ میں جب کمرے میں آئی تو نظیر صاحب پہلی جماعت میں پڑھنے والی بیٹی سے سرور بارہ بنکوی کا تعارف کروا رہے تھے۔

''بیٹا یہ تمھارے سرور انکل ہیں، اُردو کے بڑے شاعر۔ اور ہاں تم کھانا لگاؤ میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔''

نظیر صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں کچن میں۔

اچانک سرور بھائی کی تیز آواز آئی، ''بھابھی آپ کہاں ہیں، مجھے نقاد کی اولاد سے بچائیں۔''

میں آتے ہی رخشی کو ڈانٹنے لگی۔

''امی میں نے کچھ نہیں کہا۔ صرف انکل سے یہ پوچھا کیا آپ علامہ اقبال سے بھی بڑے شاعر ہیں؟''

اب سرور بھائی کو ہنسی آ گئی اور ٹھیٹ پوربی لہجے میں بولے، ''یہ بات جا کے تم اپنے باوا سے پوچھو۔''

پھر مجھ سے کہنے لگے، ''بڑی ہمت ہے آپ کی۔ نقاد اور نقاد کی اولاد دونوں کو سنبھالے ہوئی ہیں۔''

اب کے مجھے ان کی یہ بات بُری نہیں لگی۔

اتنے میں نظیر صاحب بھی آ گئے، ''کیا ہو رہا ہے؟ انکل سے کیا باتیں ہوئیں؟''

انھوں نے رُخشی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ابو، میں نے انکل سے اتنا پوچھا کیا علامہ اقبال سے بھی بڑے شاعر ہیں؟ بس انکل نے امی کو بلالیا۔"

میں، نظیر صدیقی اور سرور بھائی کو ہنستا ہوا چھوڑ کر کچن میں آ گئی۔

اس دلچسپ واقعے کے بعد نظیر صاحب اپنے شاعر ادیب دوستوں کا بچوں سے تعارف کرانے میں محتاط ہو گئے۔

ڈھاکا چھوڑنے کے بعد سرور بھائی سے ہم لوگوں کی یہ پہلی ملاقات تھی۔

میز پر کھانا لگا کر میں کچن سمیٹنے میں لگ گئی۔

اچانک نظیر صاحب نے آ کر کہا، "سرور کے لیے کھچڑی بنا دو۔"

"کیوں، ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس ڈش کے ساتھ میرے ذہن میں ہمیشہ بیماری کا تصور رہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ تم خود جا کر پوچھ لو۔" نظیر صاحب کو میرا سوال کرنا حسب معمول بُرا لگا۔

دن کے ڈھائی بجے بے وقت کی فرمائش سے مجھے کوفت ہوئی، "ٹھیک ہے میں خود سرور بھائی سے معلوم کر لیتی ہوں۔"

میں جب کھانے کے کمرے میں گئی تو ان کو سلاد اور شامی کباب سے شغل کرتے دیکھ کر بے ساختہ میری زبان سے نکلا، "آپ تو بالکل ٹھیک نظر آ رہے ہیں، پھر یہ کھچڑی کس خوشی میں؟"

(اب میں seasoned ہو چکی تھی، کسی سے بھی بات کرنے میں الجھن نہیں ہوتی تھی۔)

"بس یونہی جی چاہ رہا تھا۔" سرور بھائی نے وجہِ فرمائش بتائی۔

"اس وقت تو آپ اسی کھانے سے اپنا جی بہلائیں، کھچڑی پھر سہی۔" میں نے سہولت سے ان کی فرمائش رد کر دی۔

سرور بھائی نے خوش گوار موڈ میں کھانا کھایا۔ حسب روایت نظیر صدیقی صاحب کی فرمائش پر اپنی غزلیں سنانے لگے جسے ہم نے ریکارڈ کر لیا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے اسی شفقت سے ملتے رہے۔ انھوں نے کبھی نظیر صاحب سے یہ نہیں کہا کہ "تمھاری بیوی تمھارے دوستوں کی عزت نہیں کرتی، بلکہ وہ تمھاری عزت بھی نہیں کرتی۔"

خدا عیش برنی کو معاف کرے، ان کے اس زہریلے جملے کے اثرات نظیر صاحب کے ذہن میں ہمیشہ رہے۔

نظیر صدیقی کے 'پرستاروں' کے اس قسم کے جملوں سے ایک مضمون تیار کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہم عظیم ہیں نہ ادیب، اس لیے یہ کام کرنے سے قاصر ہیں۔ سرور بھائی کی زبان سے ہم نے کبھی کسی کی شکایت نہیں سنی (بیوی بچوں کی بھی نہیں)۔ ادبی غیبت کرتے بھی نہیں سنا۔ کبھی پروین شاکر کی شاعری اور شخصیت پر بات نہیں کی، جب کہ ان دنوں مرحومہ کی شاعری اور شخصیت پر گفتگو کرنا ادبی فیشن بن گیا تھا۔ ہمارے گھر آنے والے ہر گریڈ کے شاعر ادیب پروین شاکر کی شاعری اور شخصیت پر تبصرہ کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھا کرتے تھے۔ سرور بارہ بنکوی نے کبھی مجھ سے سیّد ضمیر جعفری مرحوم کی طرح یہ نہیں پوچھا کہ پروین شاکر کی شاعری کا source of inspiration کیا ہے۔ وہ مہذب شاعر تھے۔

سرور بھائی کبھی کبھار اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ کہہ جاتے تھے۔ ڈھاکا کے لوگوں کا تذکرہ کرتے۔ بانو آپا اور عمارہ باجی کے بارے میں خاص طور پر مجھ

سے پوچھتے (بانو اختر شہود کبھی اچھی افسانہ نگار ہوا کرتی تھیں، اُمِ عمارہ آج کی مشہور افسانہ نگار ہیں۔)

مجھے ان دونوں افسانہ نگاروں کی شاگردہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ایک بار میں نے انھیں بتایا کہ عمارہ باجی سے اسلام آباد میں ویگن میں ملاقات ہوئی تھی، وہ زیور وغیرہ پہنے ہوئے تھیں۔

''اچھا، عمارہ اور زیور؟'' سرور بھائی نے حیرت سے کہا۔

''ان کی شادی ہوگئی ہے۔ اب ان لغویات پر ان کا حق ہے۔'' نظیر صاحب کے اس جملے پر ہم سب ہنس پڑے۔

''نظیر! میں ایمن کو چھوڑنے اسلام آباد آیا ہوں۔ نیشنل بینک میں ان کی جاب ہوگئی ہے۔ ٹریننگ کے سلسلے میں ان کو یہاں رہنا ہوگا۔ آپ لوگ خیال رکھیے گا۔''

سرور بھائی بیٹی کی وقتی جدائی سے اداس تھے۔ اولاد کتنا ہی پڑھ لکھ جائے والدین سدا ان کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ سرور بھائی کو اپنی بڑی بیٹی ایمن سے خاص لگاؤ تھا۔

''تم فکر مت کرو۔ اسلام آباد محفوظ جگہ ہے۔ پھر ہم لوگ ہیں۔'' نظیر صاحب نے بڑی اپنائیت سے انھیں اطمینان دلایا۔

خدا کا شکر ہے ایمن کو ہماری کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔

''اپنا فون نمبر بتاؤ، میں ایمن کو دے دوں گا۔'' سرور بھائی نظیر صاحب سے مخاطب ہوئے۔

''ہمارے یہاں فون نہیں ہے۔'' نظیر صاحب نے انھیں جواب دیا، ''تم میرے پڑوسی کا فون نمبر رکھ لو، میں بوقتِ ضرورت استعمال کرتا ہوں۔'' نظیر صاحب نے

پڑوس کا فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔

''بھابھی گھر میں گاڑی نہ ہو مگر فون ضرور ہونا چاہیے۔ ابھی آپ کے بچے چھوٹے ہیں، جب یہ کالج یونیورسٹی جائیں گے تو آپ کو فون لگوانا ہوگا۔ گھر چھوٹا ہو مگر علاقہ اچھا ہو۔'' سرور بھائی کی یہ نصیحت بھی میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں محفوظ ہوگئی۔

جب ہماری بڑی بیٹی کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہوا تو میں نے بھاگ دوڑ کر دو ماہ میں فون لگوالیا (جب کہ ان دنوں فون لگوانا ایک کارنامہ سمجھا جاتا تھا)، سرور بھائی نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ آج ہمارے پاس تین کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ ہے مگر علاقہ اچھا ہے۔

ایک شام پڑوس سے بچی نے آکر کہا، ''انکل گھر پر ہیں؟ ان کے دوست کا فون آیا ہے۔''

''کہہ دو نظیر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ تم ان کا نام پوچھ لو۔'' میں نے اپنا کام کرتے ہوئے جواب دیا۔ رات کے کھانے کی تیاری کے ساتھ ساتھ بچوں کو اسکول کا کام کروارہی تھی اس لیے جانے کا موڈ نہیں ہوا۔

''آپ آکر خود بات کرلیں۔'' بچی مجھے مشورہ دے کر ہوا ہوگئی۔

چولھے کی آنچ دھیمی کر کے فون سننے چلی گئی۔

''السلام علیکم بھابھی۔''

''آپ کون ہیں؟'' میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''بھابھی میں بول رہا ہوں۔''

(یا الٰہی مجھے اپنی حالت پر رحم آگیا)

''بھائی آپ کا کوئی نام تو ہوگا۔'' (ان دنوں فون پر آواز پہچاننے میں بہت کچی تھی، آج بھی مجھے دِقت ہوتی ہے)۔

''میں سرور بول رہا ہوں۔'' نہایت صبر و تحمل اور شائستگی سے جواب ملا، دل میں تھوڑی خفت ہوئی مگر میں نے ظاہر نہیں کی۔ (ان دنوں میرے پاس اپنے لیے وقت نہیں ہوا کرتا تھا، خفت کے لیے کہاں سے وقت لاتی)۔

''نظیر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر میں بات جلد از جلد ختم کرنا چاہتی تھی۔

''میں آپ کے گھر سے بہت قریب ہوں۔ میلوڈی سے بول رہا ہوں۔ آج نائٹ کوچ سے کراچی جا رہا ہوں، پھر وہاں سے ڈھاکا چلا جاؤں گا۔'' سرور بھائی نے اپنے پروگرام سے مجھے آگاہ کیا۔

''مگر وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔'' میں نے انھیں یاد دلایا۔

''میں کچھ دیر انتظار کرلوں گا۔'' سرور بھائی نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''پتہ نہیں وہ کب تک گھر آئیں۔ آپ کو خواہ مخواہ زحمت ہوگی۔'' میرا ذہن اپنے کام میں اٹکا ہوا تھا (دوسرے معنوں میں چولھے بھاڑ میں تھا)۔

''ٹھیک ہے، آپ نظیر کو میرا اسلام کہہ دیں گی، میں ڈھاکا میں آپ کے ایڈن گرلز کالج کو آپ کا سلام کہہ دوں گا، ان راستوں کو بھی سلام کروں گا جہاں سے سب یونیورسٹی جایا کرتے تھے۔ محمد پور جا کر آپ کے گھر کو بھی آپ کا سلام کہوں گا اور اس کی تصویر بھی لانے کی کوشش کروں گا۔''

''اچھا سرور بھائی، خدا حافظ۔''

ان کی کسی بات کا جواب دیے بغیر میں نے فون رکھ دیا۔ نظیر صاحب نے آتے ہی عادتاً دریافت کیا، ''کوئی آیا تھا؟''

''کوئی نہیں آیا۔ البتہ سرور بھائی کا فون آیا تھا۔ وہ ڈھاکا جا رہے ہیں۔''

میں نے انھیں بتایا۔

’’تم انھیں تھوڑی دیر کے لیے بلا لیتیں، ملاقات ہو جاتی۔‘‘

’’وہ تو آنا چاہ رہے تھے مگر میں نے روک دیا۔‘‘

’’آپ تو اس کام میں ماہر ہیں۔‘‘ نظیر صاحب نے میری خبر لی۔

’’آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔‘‘ میں ان کی تنقید سنی ان سنی کرتے ہوئے بولنے لگی، ’’میں تو ان کی باتیں سن کر پریشان ہو گئی۔‘‘

میں نے نظیر صاحب کو سرور بھائی کی پوری گفتگو بتائی۔

’’وہ ڈھاکا جا رہے تھے اس لیے ان کی یہ حالت تھی۔‘‘

نظیر صاحب کی آنکھوں میں کوئی پرانی مسکراہٹ ابھری۔ ’’میں ڈھاکا جاؤں تو میری کیفیت بھی ایسی ہی ہو۔ آپ پریشان نہ ہوں۔‘‘ نظیر صاحب نے مجھے مطمئن کیا۔

میں جب ۲۰۰۲ء میں ڈھاکا گئی تو میرا حال بھی سرور بھائی سے مختلف نہیں تھا۔

ڈرامہ ختم ہونے والا تھا۔ نظیر صاحب کسی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور فوراً ٹی وی کی آواز بند کر دی۔ انھیں تیز آواز بُری لگتی تھی۔ میں کچن میں چلی گئی۔

میں جب چائے لے کر آئی تو خبرنامہ شروع ہو چکا تھا۔ ٹی وی کے قریب جا کر خبریں سننے کے لیے میں نے ٹی وی کی آواز ذرا اونچی کی۔ خبر سنتے ہی میں نے گھبراہٹ میں آواز تیز کر دی مگر وہاں موت کی خبر ختم ہو چکی تھی۔ زندگی کی تصویر چل رہی تھی۔

’’کیا کر رہی ہو؟‘‘ نظیر صاحب ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے بولے۔

’’سرور بھائی کا انتقال ہو گیا۔‘‘

’’کیا کہہ رہی ہو!‘‘ نظیر صاحب نے بھی گھبرا کر آواز تیز کر دی۔ پھر مکمل بند۔

مہمان ہماری ذہنی حالت دیکھ کر خاموشی سے چلے گئے۔

''''پوری خبر سناؤ، سروؔر کے بارے میں کیا سنا تم نے؟''نظیر صاحب تفصیل جاننا چاہتے تھے۔

''میں نے صرف اتنا سنا، بارہ بنکوی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔''میں نے یقین کے ساتھ کہا۔

''مجھے بھی یہ خبر درست معلوم ہوتی ہے۔''ضبطِ غم سے نظیر صاحب کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات کے بعد دوسری رات تھی جب ہم لوگوں نے کھانا ٹونگ کر چھوڑ دیا تھا۔''جنگ'' راولپنڈی کے فلمی صفحے پر اداکارہ شبنم کا انٹرویو دیکھا، ''سرور صاحب ڈھاکا فال کے بعد بہت بدل گئے تھے۔ وہ پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ بہت محتاط زندگی گزار رہے تھے۔ مخلص انسان تھے۔ ہم لوگوں کو ان کی بے وقت موت کا دکھ ہے۔ کاش! وہ جنگی قیدیوں کے حوالے سے اپنی فلم بنا سکتے!''

''سروؔر پر مضمون لکھا ہے، پڑھ لو۔ کاش! میں نے یہ مضمون ان کی زندگی میں لکھا ہوتا۔ شریف انسان تھے۔ کبھی اشارتاً بھی مضمون لکھنے کے لیے نہیں کہا۔'' نظیر صدیقی صاحب کے لہجے میں تاسف تھا۔

ڈھاکا فلم ''آخری اسٹیشن'' کے فلم ساز کی زندگی کا آخری اسٹیشن بن گیا۔ عارفہ بھابھی زندگی کے پلیٹ فارم پر سے دکھ سکھ کی گٹھری اٹھائے ایک دن ملکِ عدم روانہ ہو گئیں۔

نظیر صدیقی کی کتابِ زندگی دیکھتے ہی دیکھتے کتبہ بن گئی۔

میں حال کے فریم میں ماضی کی تصویر لگانے پر مامور کر دی گئی۔

○○